R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy-12 P.

جلد ۲۶ - شمارہ ۱۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء

اداریہ

نئے صدر جمہوریہ

۹ مئی کو اعلان ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک لاکھ سات ہزار ووٹ کی اکثریت سے ہندوستان کے نئے صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے۔ ۱۳ مئی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے انھوں نے اپنے نئے عہدہ کا حلف لیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ کے اولڈ بوائے یونین کے نائب صدر، جامعہ ملیہ کے معمار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، رادھا کرشنن کمیشن کے ممبر، گاندھی جی کی بنیادی تعلیمی کمیٹی کے صدر، ساہتیہ اکاڈمی کے نائب صدر، انجمن ترقی اردو ہند کے صدر، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر، اور ہندوستان کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ اردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تعلیمی خطبات، اقتصادیات مقصد اور منہاج، ریاست (ترجمہ افلاطون) ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ برسوں رسالہ جامعہ میں حالات حاضرہ پر بڑے جامع تبصرے لکھتے رہے۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں جلال و جمال ہے۔ ریاست پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ افلاطون پر ہی جامع تبصرہ نہیں، ان کے جامع اور شگفتہ اسلوب کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ انگریزی میں سرمایہ داری پر ان کے لیکچر اور ہندوستان کے نظام تعلیم پر پٹیل میموریل لیکچر اور متعدد یونیورسٹیوں میں کانووکیشن کے خطبے، ان کی نظر کی گہرائی اور ان کے حکیمانہ، بلیغ اور شگفتہ اسلوب کے شاہکار ہیں۔

ان کا صدر منتخب ہونا کئی حیثیتوں سے ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ وہ دراصل ایک معلم ہیں اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی طرح علم کی برگزیدگی، اس کی جامعیت اور اس کی تازہ کاری اور تازہ خیالی کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے خواب دیکھے ہیں اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ جامعہ ملیہ کی کشتی جب بھنور میں پڑ گئی اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے چلانے کا بیڑا اٹھایا اور اس ادارے کو تعلیمی، ادبی، تہذیبی پہلوؤں سے ایک ممتاز اور قابل فخر ادارہ بنادیا۔ وہ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے ایک طرف علی گڑھ کے امتیازی پہلوؤں پر اصرار کیا اور دوسری طرف اس کو ہندوستان کے جلوہ صد رنگ کے آئینے میں دیکھا اور دکھایا۔ انھوں نے علی گڑھ کو قومی زندگی کے دھارے کے ساتھ چلنا، اور قوم کو علی گڑھ سے محبت کرنا اور اس کی قدر کرنا سکھایا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اس کے علمی و ادبی کاموں کا آغاز کیا۔ انھوں نے اردو زبان کے قومی رول پر اصرار کیا اور اس کے حقوق کو تسلیم کرنے کی طرف حکومت اور عوام کو توجہ دلائی۔ انھوں نے ہر حال میں اعلیٰ اقدار، بہترین افکار، صالح روایات اور معنی خیز تجربات پر زور دیا۔ انھوں نے ہندوستان کی مشترک تہذیب کے تمام عناصر اور ہندوستان کی پوری تاریخ کو ذہن میں رکھنے پر اصرار کیا۔ ہندوستانیوں کو انھوں نے رنگ و نسل کے امتیاز اور مذہبی تعصب سے بلند رہنے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو اپنے وطن پر فخر کرنا اور اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونا سکھایا۔ انھوں نے سیاسی یا مذہبی اختلاف کے باوجود دوسروں کے خیالات کا احترام کرنے کی ہدایت کی۔ انھوں نے باتیں کرنے کے بجائے کام کرنے پر زور دیا۔ حقوق کے مطالبے کے ساتھ فرائض کی ادائی پر اصرار کیا۔ انسانیت کو ہر حال میں ملحوظ رکھا۔ اور امید اور حوصلے کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑا۔

ہمیں یقین ہے کہ ان کی قیادت میں ملک ترقی کرے گا، اس میں قومی یگانگت بڑھے گی۔ وہ اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہوگا، اس کا اخلاقی کردار بلند ہوگا، اور وہ جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی منزل پر تیزی سے گامزن ہوگا۔ اقبال نے گویا انھیں کے لیے کہا تھا ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

بچوں کی کتابوں کی بین الاقوامی نمائش

اردو کی کتاب انعام کی مستحق

نئی دہلی - چلڈرن بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام بچوں کی کتابوں کی یہاں جو بین الاقوامی نمائش ہوئی اس میں ہندوستان کی کتابوں کو انعامات اور چار کو اسناد اعزاز دیے گئے۔ اگرچہ اس نمائش میں ۲۵ ممالک نے کتابیں بھیجی تھیں لیکن انعامات صرف ہندوستانی کتابوں کو ملے جن کتابوں کو انعامات ملے ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی اردو کتاب "ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں" بھی شامل ہے۔ ہندی کی کوئی کتاب انعام یافتگان میں شامل نہیں۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

لندن میں یوم اقبال

لندن - ۹ مئی - یہاں جمعہ کے روز یوم اقبال منایا گیا اور برطانوی فلاسفروں اور دانشوروں نے علامہ اقبال کی زندگی، ان کے فلسفے اور ان کے کلام پر مقالے پڑھے۔ مشہور برطانوی فلاسفر رسل نے اپنے مقالہ میں کہا کہ علامہ اقبال نے فلسفۂ اخوت و آزادی پر زور دیا ہے۔ وہ مغرب کے انداز کو انکی تیج اور اچھی طرح سمجھ گئے تھے اور انھوں نے عوام کے دلوں میں سامراج کی مخالفت کا جذبہ بھر دیا۔

(دعوت، دہلی)

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۰۴ ویں سالگرہ

کلکتہ - ۹ مئی - کو یہاں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۰۴ ویں سالگرہ منائی گئی۔ جوڑا سانکو میں ان کے آبائی مکان میں لوگوں کی کافی تعداد انھیں خراج عقیدت پیش کرنے گئی۔ اس موقع پر ان کا مکان اور عجائب خانہ عوام کے دیکھنے کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ (سنگم، پٹنہ)

سوویت لینڈ نہرو انعام یافتگان ماسکو روانہ

نئی دہلی - ۱۰ مئی، سوویت لینڈ نہرو انعام بابت ۱۹۶۶ء جیتنے والے چھ انعام یافتگان سوویت یونین کے پندرہ روزہ دورے پر آج صبح ماسکو روانہ ہوئے۔ انعام یافتگان میں مسز سروجنی داس، یوگی سدھانند بھارتی، کرشن چندر، پی ڈی گیند گل اور وکٹنا رنجن باسو شامل ہیں۔ یہ پنڈت جواہر لال کی یادگار کے طور پر عظیم تر سوویت ہند دوستی فنڈ ۱۹۶۴ء میں قائم کیا گیا تھا۔ ہند سوویت دوستی اور عالمی امن کے متعلق بہترین ادبی اور صحافتی تخلیقات پر ہر سال نہرو جینتی کے موقع پر انعام دیے جاتے ہیں۔

اردو، دہلی کارپوریشن میں

نئی دہلی - ۱۰ مئی - رخصت ہونے والے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے اعزاز میں ہونے والے استقبالیہ کے لیے دہلی میونسپل کارپوریشن نے دعوت نامے ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی جاری کیے ہیں۔ اس سے قبل سوڈان کے صدر اسماعیل الازہری کے اعزاز میں جو استقبالیہ ہوا تھا اس کے لیے دعوت نامے ہندی اور انگریزی میں جاری ہوئے تھے۔

(سیاست جدید، کانپور)

غالب کے جشن صد سالہ کیلئے بین الاقوامی تعاون کی کمیٹی

غالب کے جشن صد سالہ کی مرکزی کمیٹی نے دنیا کے اہل علم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو بین الاقوامی تعاون کی کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا ہے جو آج کل روس میں مقیم ہیں۔

پروفیسر فاروقی نے ماسکو ریڈیو سے دو تقریریں اردو اور انگریزی میں نشر کی ہیں جو جشن غالب کے لیے دعوت بھی ہیں اور صلائے عام بھی۔

جولائی اور اگست میں پروفیسر فاروقی چیکوسلواکیہ، رومانیہ، جرمنی، فرانس، انگلستان اور امریکہ بھی جائیں گے اور وہاں بھی کوشش کریں گے کہ جشن صد سالۂ غالب کی کمیٹیاں ہر ملک میں بن جائیں۔

(نامہ نگار)

نوٹنگھم (انگلینڈ) میں "اردو لائبریری"

نوٹنگھم میں حال ہی میں اردو لائبریری کا افتتاح کیا گیا اور پہلی بار پیرس، لندن، برمنگھم، نوٹنگھم، نیوکاسل اور افریقہ سے شرفائے اردو نے شرکت کی۔ لائبریری کے افتتاح کے بعد ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شعراء نے حصہ لیا۔ یہ نشست بہت کامیاب رہی۔

عبد السمیع

بچوں کا ایک نیا رسالہ

کرناٹک میں بچوں کا واحد رسالہ ماہنامہ "گلاب" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس ماہنامہ میں بچوں کیلئے انوکھے انعامی مقابلے، دلچسپ کہانیاں، لطیفے، کارٹون وغیرہ ہوں گے۔ یہ ماہنامہ زاہد تماپوری ایڈیٹر ماہنامہ "گلاب" شرقی، روڈ ڈاکخانہ نگم پیٹھ ضلع گلبرگہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شرر کے مزار کا تحفظ

لکھنؤ - مولانا شرر سوسائٹی کی ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ شرر لائبریری عبد العزیز روڈ لکھنؤ میں ہوا۔ جلسہ نے تفصیل سے اس صورت حال پر غور کیا کہ مولانا شرر کے مزار کے راستے کو بند کر دیا گیا ہے اور اس کا خطرہ لاحق ہے کہ اس گنبد کو جس کے اندر مزار ہے نقصان پہنچ جائے۔ جلسہ نے ایک تجویز میں تشویش اس جذبہ کا شدید طور پر اظہار کرتے ہوئے مزار کے تحفظ کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلسہ میں اردو شعراء، ادباء، ناول نگار، ادبی انجمنوں اور اردو سے متعلق اداروں اور ہمدردوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اردو کے اس عظیم ادیب اور ناول نگار کے آخری نقوش کی حفاظت کیلئے شرر سوسائٹی سے تعاون کریں۔

سید رضی الحسن

فیض کے یہاں محبوب کا تصور

کبھی مولانا حالی نے مقدمہ میں اس بات پر زور دیا تھا کہ شاعری میں عشق و محبت کی کہانی وہی کامیابی سے بیان کر سکتے ہیں جو خود اس کی زد میں آ چکے ہوں۔ یوں تخیل کے سہارے جھوٹا عاشق بننے سے بات میں وزن پیدا نہیں ہو سکتا اور حقیقت سے ہٹ کر کوئی بھی فن کار زیادہ دیر تک ٹھہر بھی تو نہیں سکتا اسے بہر حال حقیقتوں تک آنا پڑے گا۔ یہ بات نہیں ہے کہ حالی سے پہلے کا جتنا سرمایہ ہے اسے واقعیت سے تعلق نہیں ہے۔ ان سے پہلے چاہے قلی قطب شاہ ہوں یا ولی، میر ہوں یا ذوق و غالب، یہ سب حقیقت نگار رہے۔ لیکن آخر میں لکھنؤ اسکول آف تھاٹ ایسے بہت سے شاعروں کو سامنے لے آیا جنھیں زیادہ تر محض تخیل کو رکھ دھندوں سے کام تھا۔ مولانا حالی اسی طرح کی شاعری سے نالاں ہوئے اور انھوں نے مقدمہ سے ضرب لگائی۔ وہ قدیم ادب کے پرستار اس حد تک تھے جس حد تک اس میں حقیقت نگاری کو دخل ہے۔

مولانا حالی ہوں یا پروفیسر آزاد، دونوں آدمیوں کے خیالات مغربی ادب نے بدلے تھے۔ اس وقت مغربی ادب سے جو روشنی مل رہی تھی وہ ایسے پڑھے لکھے لوگوں کو سامنے لا رہی تھی جو آنکھیں کھلی رکھتے تھے جو ہر پرانی چیز کو اس لیے حقارت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے کہ وہ پرانی ہے۔ وہ قدیم سے الفت رکھتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی بھی نئی چیز پرانی کوکھ ہی سے جنم لیتی ہے۔ نئے خیالات انھیں نئے ماحول کے تقاضوں کو سمجھنے میں مدد دے رہے تھے اس لیے وہ انھیں حاصل کر رہے تھے۔ فیض احمد فیض انہی خیالات کی پیداوار ہیں۔

فیض محض تخیل کے سہارے ایک مثالی محبت کی مثال پیش نہیں کرتے بلکہ جذبات کی انتہائی شدت کو وہ خوب صورت طریقے سے ظاہر کرتے ہیں اظہار سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہماری اور آپ کی دنیا میں ہمیشہ یوں ہی ہوتا آیا ہے۔

محبت کا جذبہ عام ہے۔ عاشق و معشوق دونوں کے جذبات کی تصویریں شاعروں نے اتاری ہیں۔ بارہا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ عاشق محبوب کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ فیض محبوب کے علاوہ بھی سوچتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دل میں ہر وقت ایک ہی خیال قائم نہیں رہ سکتا۔ آج کی دنیا میں اس طرح کی مثالیں شاذ ملیں گی جو صرف کسی ایک کے تصور میں آدمی نے اپنی زندگی گذار دی ہو۔ آج کی نئی دنیا تو مختلف جھمیلوں کی دنیا ہے آدمی پستا رہتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ فیض مختلف حالات کی چکی میں پستے ہیں اپنی محبوب کے پاس پہونچتے ہیں لیکن دل بجھا بجھا سا ہے، آنکھیں نمناک سی ہیں،

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

....

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

دل میں یوں اب ترے بچھڑے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبہ میں صنم آتے ہیں

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

فیض کے یہاں رقیب کا تصور بالکل الگ سا ہے۔ وہ اسے اپنا دوست سمجھتے ہیں اور اس سے یہ غم کہہ کے اپنا دل بھر رہے ہیں۔ انھیں اس سے باتیں کرتے ہوئے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اپنوں سے باتیں ... ان باتوں میں محبوب کے لیے کتنی تڑپ ہے کتنی لگن ہے۔

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا ہے

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے
تجھ سے کھیلی ہیں وہ بے سود ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی یادوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

محبوب سے الگ ہو کر فیض کو دل برا کرنا نہیں آتا وہ اس کے تصور ہی سے اپنی دنیا حسین و رنگین بنائے رکھتے ہیں۔ ان کو اس علاحدگی، اس جدائی میں بڑا مزا ملتا ہے جیسا علامہ اقبال نے کہا تھا۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

فیض بھی محبوب کے فراق میں روتے دھوتے نہیں بلکہ تنہائی میں اس کی یاد سے اپنے کو بہلاتے ہیں۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

محبوب سے جدائی کی راتیں مصیبت کی گھڑیاں اور زندگی کی اور دوسری آزمائشیں فیض کے محبت کے جذبے میں کسی قسم کا اضمحلال نہیں پیدا کرتیں۔ ان مخالف حالات میں وہ اپنے کو سنبھالتے ہیں اور محبوب کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ دونوں عاشق و معشوق مل کر حالات کا مقابلہ کریں گے تو حالات کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور وہ اس ماحول میں سانس لے سکیں گے جس کے لیے وہ محبت میں چور ہو کر ایک دوسرے کے نزدیک پہونچے ہیں ایک دوسرے کو اپنا سمجھ سکے ہیں۔ اپنے محبوب کی حوصلہ افزائی وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پہ قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز میری جان فقط چند ہی روز

فیض کو اس کا شدید احساس ہے کہ ان کے کلام میں جادو اثر محبوب ہی نے تو بخشا ہے۔ جو بھی سنتا ہے جو بھی پڑھتا ہے اس کی خوبصورتی کا دلدادہ و شیدا ہو جاتا ہے زبان کی روانی اور الفاظ کی نشست ان کی قادر الکلامی کی شاہد ہے ان کے کلام کی یہ رنگینی یہ جاذبیت، یہ نکھار، یہ بناؤ اور یہ بہار محبوب ہی کی بدولت تو قائم ہے۔ محبوب نے ان کی شاعری کو شاعری بنایا ہے۔ اب فیض ہی کی زبان میں سنیئے۔

(باقی صفحہ ۸ کالم ۲ پر)

غزلیں

آزاد گلاٹی

آواز دے کے چھپ گیا کوئی خلاؤں میں
اور ہم بھٹکتے پھرتے رہے گاؤں گاؤں میں

پہلے تو ان سے دل میں اتر آتی تھی ٹھنڈک
کیوں آگ سی لگی ہے اب کالی گھٹاؤں میں

شیطان دیکھ کر انھیں حیران رہ گیا
جھگڑا اٹھا ہے جب بھی کبھی دیوتاؤں میں

دھرتی جھلس رہی ہے تو سورج کی دھوپ سے
چھالے پڑے ہیں آج بھی پیپل کی چھاؤں میں

آزاد اپنے دل سے ہمیں مات ہو گئی
اپنا بھی تھا شمار کبھی سورماؤں میں

اختر تنکی

جو آواز ابھی ابھری ہے
کچھ جانی پہچانی سی ہے

دروازے پر دھیرے دھیرے
دیکھو کس نے دستک دی ہے

ہنگامہ ہے ذہن میں میرے
تنہائی خاموش کھڑی ہے

زور نہیں ان کی باتوں میں
ہاں آواز بہت اونچی ہے

پیچھے لوٹ کے جاؤں کیسے
اور آگے دیوار کھڑی ہے

کھل کے رہا راز اپنے دل کا
ایسی بات کہاں چھپتی ہے

آنگن میں آہ پھول کھلا ہے
دروازے پر بھیڑ لگی ہے

شہروں شہروں ملکوں ملکوں
دل کی زباں سمجھی جاتی ہے

درد نے تنکی پہلو بدلا
یادوں نے انگڑائی لی ہے

اشفاق احمد اعظمی

وفا نہیں کر علاج جفا نہیں کرتے
جنوں پسند محبت میں کیا نہیں کرتے

اک ایسی منزل غم سے گزر رہی ہے حیات
کہ ہم جفاؤں کا ان کی گلا نہیں کرتے

جو لوگ وقت کی کچھ اہمیت سمجھتے ہیں
وہ چین سے کبھی بیٹھے رہا نہیں کرتے

فراز دار سے ہنس ہنس کے جو گزرتے ہیں
وہ مرگ جسم سے یارو ڈرا نہیں کرتے

ہزاروں برق کی چوٹوں کو سہنا پڑتا ہے
چراغ عزم کے یونہی جلا نہیں کرتے

وفا کے جو شرابی جام حیات چھلکا کر
ہمیں جچے ہیں یہاں سب جیا نہیں کرتے

فیضان گل یہ ترا ادب ہے حرم کا گل
اجل کے سامنے ہیں دم بھی لیا نہیں کرتے

یہی ہے المیہ اشفاق حضرت دل کا
پکارتے ہیں جنھیں وہ سنا نہیں کرتے

ساجد اختر

درد ہی نے دیا قرار مجھے
اور غم سے ملا نکھار مجھے

نور کے جھومتے شبستاں میں
ظلمتوں نے کیا شکار مجھے

لے گیا آنسوؤں کی وادی میں
تیری یادوں کا آبشار مجھے

میری مجروح آرزو کے لیے
چاہیے چھیتی بہار مجھے

آس کی راگنی سمجھتی ہے
ایک ٹوٹا ہوا ستار مجھے

حادثوں کا صحیفہ کھلتے ہی
ہو گیا زندگی سے پیار مجھے

تیرگی کے مہیب گنبد میں
روشنی کا ہے انتظار مجھے

پھول کی لاج ہوں اختر لیکن
لوگ سمجھے ہوئے ہیں خار مجھے

نیا گلاب

وقار خلیل

(نظام دکن آصف ثامن کے نام)

نیا گلاب چمن زار آصفی میں کھلا
مہک مہک گئی ارض دکن زمین وفا
شگفتہ حسین و دلآویز جیسے بدر منیر
فضائے دیدہ و دل میں نوید صبح بہار
قرار فکر و نظر، تازگی حسن خیال
نگار صبح سحر ہے جس کی خوشبو ہے
خدا کرے کہ یہ خوشبو سفیر گل بن کر
جدھر جدھر بھی ہو رقصاں شمالِ بادِ سحر
کلی کلی کو شگوفہ بہار دیتی رہے
کرن کرن سے وفا کا خراج لیتی رہے
نیا گلاب چمن زار آصفی میں کھلا
مرے وطن ابھی تجھ کو گزشتہ کو نور ملا

روایت

علیم اختر غازی پوری

شاید ہماری بات ہے جذبہ شکن بہت
سنگین ہیں یقین و خرد کے چلن بہت
مجروح ہو گئے ہیں انھیں سے بہت سے خواب
شاید نہ لا سکے انھیں سنگینیوں کی تاب
ہم پر جو ہنس رہے ہیں یہ چند نوجوان وقت
ٹھہرا نہیں ہے آج بھی یہ کاروان وقت
ان کی بھی زندگی میں یہی لمحہ آئے گا
باتیں کریں گے ہوش و خرد کی تو سن کے پھر
ان پہ ہنسیں گے لوگ، کہا کچھ نہ جائے گا
باتوں کو ان کی لوگ ہنسی میں اڑائیں گے
یہ پیچ و تاب کھائیں گے دو ہنستے جائیں گے
ہم پر جو ہنس رہے ہیں تو ہنسنے بھی دو انھیں
یہ تو ہے اک روایت پارینہ کیا کریں
برگ خزاں رسیدہ پہ ہنستی ہیں کونپلیں

میرا دل، میری زندگی

جمال الدین جمال

اک چراغ حسیں، مرا دل ہے
ناامیدی اسے بجھاتی ہے
اور امید اسے جلاتی ہے
زندگی میری، ایک محفل ہے
دل کے بجھنے سے تیرہ ہوتی ہے
دل کے جلنے سے جگمگاتی ہے

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ہمزہ کیوں ؟

(۳)

۷۔۶۔ اضافت سے متعلق مندرجہ بالا تمام اصولوں کو تشکیلی لسانیات کے ایک چھوٹے سے قانون میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے :

	hamza		hāe mukhtafi
Izafat ⟶	ye	after	alif or wāo
	zero		yāe majhūl following a
	kasra		otherwise

یہ مختصر اور جامع قوانین کو زبان کے مباحث میں استعمال کرنے کی راہ چامسکی نے اپنی تشکیلی گرامر میں دکھائی ہے۔ ان پر ریاضی منطق اور الجبرا کا اثر ظاہر ہے۔ یہاں تیر کے نشان کے معنی ہیں rewrite یعنی دوبارہ لکھو۔ اس کے بعد کھڑی لکیروں کی دو مستطیلیں ہیں۔ کھڑی لکیروں کا مطلب ہے کہ ان میں سے بہ یک وقت صرف ایک چیز لی جائے؛ اور ایک مستطیل سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کے ساتھ مقابل کی مستطیل سے متوازی شکل کی چیز لینی ہوگی۔ مندرجہ بالا قانون لفظ اضافت سے شروع ہوتا ہے یعنی اضافت ایک ذہنی تصور (abstraction) ہے، جس کو ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے۔ اب دونوں مستطیلوں سے پہلی چیز کو لیجیے تو اس کا مطلب ہوا کہ اضافت لکھی جائے گی ہمزہ سے اگر وہ بعد میں آئے ہائے مختفی کے یعنی اگر مضاف ختم ہو ہائے مختفی پر۔ اسی طرح اضافت لکھی جائے گی یائے سے اگر مضاف ختم ہو الف یا واؤ پر؛ اضافت لکھی جائے گی صفر سے، یعنی کسی چیز سے نہ ظاہر کی جائے گی، اگر مضاف ختم ہو یائے مجہول بعد فتحہ پر، اور اضافت لکھی جائے گی کسرہ سے دیگر تمام صورتوں میں۔

۷۔۷۔ شمع، نفع، قسم کے الفاظ اگرچہ ساکن الآخر ہیں لیکن اردو کی عام بول چال میں انھیں چھوٹے مصوتے /a/ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ مضاف حالت میں یہ /a/ تلفظ میں ساکت ہو جاتا ہے اور اضافت کا /e/ باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ الفاظ جو [illegible] سے بولے جاتے ہیں، مثلاً دقائق، صنائع، ذرائع [illegible] مضاف حالت میں اصل لفظ کی /e/ کے بعد [illegible] /e/ [illegible] آتی ہے اور پہلی /e/ دوسری /e/ میں [illegible] دکھو دیتی ہے یعنی دقائق نعمت خان [illegible] کو مضاف تو کسرہ سے کیا جائے گا لیکن دقائق کی آخری /e/ اور اضافت کی /e/ کا انضمام ہو جائے گا۔

(واضح رہے کہ یہ اصول بنیادی زبان کے ہیں، شاعری میں عروضی ضرورتوں کی وجہ سے مصوتوں کی طوالت کو گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمزہ کا استعمال یا اضافت کو ظاہر کرنے کے اصولوں میں حسبِ موقع تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مصرعوں میں بازو اور گیسو کی اضافت کو بجائے ے کے کسرہ سے ظاہر کرنا زیادہ مناسب ہوگا :

ع شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا

ع گیسوِ تاب دار کو اور بھی تاب دار کر)

۸۔ **نتائج** : اوپر کی بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں، مختصراً وہ یوں ہیں :

(۱) ہمزہ کے معاملے میں بنیادی چیز تلفظ ہے، اگر کسی لفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں (رسائل، تائب، عجائب، فائدہ، کھائیے، آؤ، گئے، فرمائیے، اٹھائیے، آئیے، جائیے) تو اسے ہمزہ سے لکھنا چاہیے، ورنہ نہیں۔ (جوؤں کی ماضی ہوا اس کلیے سے مستثنیٰ ہے)۔ یہ بھی واضح رہے کہ اردو میں دو مصوتوں کا جوڑ جہاں عین سے آتا ہے، وہاں ہمزہ استعمال نہیں ہوتا۔

(۲) جن الفاظ میں مصوتے اور نیم مصوتے ی کا جوڑ ہے، وہ ہمزہ سے نہیں لکھنے چاہییں۔ (لیے، لیجیے، دیے، پیے، پیجیے، دیکھیے، سنیے، چاہیے، کیے، کیجیے، دیجیے)۔

(۳) اضافت کے لیے ہمزہ صرف ان الفاظ پر لگتا ہے جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں (جذبۂ دل، نالۂ درد)، جہاں ہ تلفظ میں ادا ہوتی ہو، وہاں اضافت کسرہ سے لکھی جاتی ہے (شہِ دل، وجہِ جواز، ماہِ نو)۔

(۴) عربی الفاظ طلبا، انشا، منشا، امرا، وزرا، فقرا اردو میں صرف آخری الف سے بولے جاتے ہیں یعنی ان میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں، اس لیے انھیں ہمزہ سے لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اگر پوری ترکیب عربی کی ہے تو وہاں ہمزہ کو برقرار رکھنا چاہیے مثلاً انشاء اللہ، ماشاء الرحمٰن، ذکاء اللہ۔ یہی حال سوء اتفاق، سوء ظن وغیرہ ترکیبوں کا ہے۔ لفظ سوء اردو میں مفرد استعمال نہیں ہوتا، اور یہ تراکیب جوں کی توں مستعار لی گئی ہیں، اس لیے ان میں ہمزہ کا استعمال جائز و درست ہے)۔

(۵) اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ البتہ اردو کے مستعار الفاظ میں لفظ مسئلہ کے تلفظ میں حلقی بندشی آواز (GLOTTAL CATCH) کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اردو میں جہاں عین کو حلقی کھٹک سے بولتے ہیں، وہاں اس کی آواز بھی یہی ہوتی ہے۔ (عین کے تلفظ پر تفصیلی بحث آئندہ کبھی کی جائے گی)۔

(۶) ہمزہ کو اُردو نے اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا لیا ہے۔ یہ علامت بے صوت ضرور ہے لیکن بے مصرف نہیں اور اُردو املا کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ہمزہ دیسی اور مستعار دونوں طرح کے الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ اور چونکہ دیسی الفاظ خصوصاً افعال کی تصریفی صورتوں کا استعمال مستعار الفاظ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے، اس لیے ہمزہ کی پوری پوری تاریخ ہو چکی ہے۔

(۷) اُردو نے عربی، فارسی اور پراکرتوں سے بہت کچھ لیا ہے، لیکن اب اس کی حیثیت ایک آزاد زبان کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا تجزیہ خود اس کی سطح پر آزادانہ کیا جائے۔ زیرِ نظر مقالے کی نوعیت اجتہادی نہیں، استنبادی ہے۔ اس میں روایت سے خواہ مخواہ انحراف نہیں کیا گیا بلکہ اُردو زبان کی سطح پر آزادانہ ہمزہ کے استعمال کا تجزیہ کر کے اس کے صحیح املا کے اصول معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدما نے ہمزہ کو اُردو کی ضرورتوں کے لیے اپنایا تو وہ بلا ضرورت نہیں تھا بلکہ کوئی نہ کوئی اصول (وجدانی طور ہی پر سہی) ان کے پیشِ نظر ضرور رہا ہوگا۔ زیرِ نظر مقالے میں اسی اصول کو صوتی سطح پر دریافت کر کے ہمزہ کے استعمال کے قاعدے سائنسی وضاحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحیح املا کے لیے اس صوتی اصول کو سمجھنا اور ان قاعدوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔[1]

(کل ہند اورینٹل کانفرنس کے علی گڑھ اجلاس میں پڑھا گیا۔)

---

[1] اس مقالے کی تیاری میں کئی موقعوں پر میں نے اپنے کرم فرما جناب مالک رام صاحب اور جناب رشید حسن خاں صاحب اور محبی عتیق احمد صدیقی سے تبادلۂ خیال کیا، جس کے لیے ان سب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

صفحہ ۴ سے آگے

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی

.....

...... یہ بھی ہیں اور کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

ان سب کو دیکھنے کے بعد یقین یہ ہوتا ہے کہ فیض کا محبوب ہمارے آپ ہی کی دنیا کی ایک فرد ہے۔ وہ مرد نہیں عورت ہے جو اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتی ہے۔

مراسلات

غالبؔ کی ایک اردو تقریظ

مندرجہ بالا عنوان سے "ہماری زبان" (۲۲ / اپریل ۱۹۹۷ء) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں نتیجہ کہا گیا ہے کہ یہ تقریظ آج تک غالبؔ کے کسی نثر کے مجموعے میں شائع نہیں ہوئی ہے اس کے بعد تقریظ درج کی گئی ہے۔ مضمون نگار سے تسامح ہوا ہے۔ یہ تقریظ اردوئے معلّٰی حصہ دوم میں موجود ہے۔ (ص ۵۰۰ طبع شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۰ء) انتخاب غالب میں بھی شریک اشاعت ہے جس کے دو اڈیشن لاہور اور حیدرآباد سے نکل چکے ہیں۔ تقریظ میں غالبؔ نے اپنے دو شعر

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابر گوہر بار

درج کئے ہیں جن کے متعلق مضمون نگار لکھتے ہیں:

"یہ قطعہ مرزا کے دیوان میں میری نظر سے نہیں گزرا" یہ قطعہ کے مشہور شعر ہیں اور دیوان کے ہر اڈیشن میں موجود ہیں۔ اس قطعے کا عنوان ہے: گزارش مصنف بحضور شاہ اور پہلے اور آخری شعر یہ ہیں:

اے شہنشاہ آسماں اورنگ — اے جہاندار آفتاب آثار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(دیوان غالب ص ۲۷۳ مرتبہ جناب مالک رام طبع اول ۱۹۵۷ء)

(مختار الدین احمد)

فراقؔ گورکھپوری کی دو بحری غزل

ہندوستان کے بلند بانگ شاعر حضرت رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری نے یہ غزل جشن جمہوریہ کے مشاعرے میں سنائی تھی اور اب ماہنامہ بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۷۷ء کے شمارے میں مع تصویر شائع ہوئی ہے۔ غزل پڑھتے ہی مجھے "گلبانگ" کا یہ شعر یاد آگیا ۔

عشق فرہاد کے برعکس ہے اپنا مسلک
جوئے شیر آتی ہے جا کر میں غزل کہتا ہوں

غزل کس بحر اور کس وزن پر کہی گئی ہے۔ اسے جانچنے کے لیے سب سے پہلے مطلع پر نگاہ پڑتی ہے۔ پہلے غزل پیش کر دوں تاکہ نمبر سے ہر شعر معلوم ہو سکے کہ کس وزن و بحر میں ہے۔

(۱)

تھی منتظر سی دنیا خاموش تھیں فضائیں — آئی جو یاد تیری چلنے لگیں ہوائیں
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

(۲)

تقلید کر رہے ہیں اس چال کی ازل سے — وہ قوس اور زمیں تارے کہاں سے لائیں

(۳)

یہ شبنمیں تبسم یہ شعلۂ ترنم — غنچے نہ توڑ دیں دم تارے کہیں بجھائیں
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

(۴)

پھر ہو رہی ہے تازہ مرے دل میں یاد تیری — پھر یاد آرہی ہیں بھولی ہوئی دعائیں
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

(۵)

رخصت ہی جا رہی ہے افسردگیٔ ہستی — شاید تری نگاہیں نبضِ حیات پائیں
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

(۶)

ترے دیکھنے کے صدقے اک بار سکھ دل کو — وہ آنکھ اٹھی نگاہیں جو پلٹ پلٹ جائیں
فعلات فاعلاتن مفعول فاعلاتن — فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن

(۷)

یہ سکوت شب یکایک ابھرتی ہوگی شبِ پیار — جو سنا رہے ترے ملنے کی کہانیاں سنائیں
فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن — فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن

(۸)

دیکھا اسے فراقؔ بدلے کیا کیا رنگ زماں — دل تنگ ہیں فضائیں کچھ بند ہیں ہوائیں
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

قطع نظر مطلع کے مفہوم اور رکیک پہلو سے۔ از روئے عروض بحر مضارع مثمن اخرب میں ہے اور دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں اور آٹھواں شعر بھی اسی بحر میں ہے۔

چوتھے شعر کا پہلا مصرع اور دوسرا مصرع دیکھئے کہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے اس شعر کو پڑھتے ہی ماہر عروض و فن حضرت سحرؔ عشق آبادی کی ایک نظم کے دو شعر یاد آگئے ۔

مشہور ہیں جہاں میں یہ دو جمیل افضل — اک سرور دو عالم اک صاحب زلیخا
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلاتن — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل — شاعر کے قول کا تو نہیں اعتبار زیبا
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلاتن

اس نظم کے دو حصے ہیں پہلے کے ابتدائی شعروں میں یہی ترتیب قائم رکھی ہے جس کا عروض متحمل ہے یعنی دوسرا مفعول اخرب نہیں بلکہ مکفوف مخنق ہے۔

اگر فراقؔ صاحب کے چوتھے شعر کے پہلے مصرع کی تقطیع بحر رمل سے کی جاتی ہے یعنی۔

پھر ہو رہی ہے تازہ مرے دل میں یاد تیری
مفعول فاعلاتن فعلات فاعلاتن

تو بھی ترجیح وزن اوّل بحر مضارع ہی کو ہے۔ چھٹا اور ساتواں شعر بحر رمل میں ہے۔ چھٹے شعر میں جو تیسرا رکن مفعول آیا ہے جو مشکول مسکن ہے۔ قابل اعتراض نہ ہوتا بشرطیکہ تمام غزل بحر رمل میں ہوتی۔

بحر رمل مشکول کے لیے اہل عروض کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں جو ارکان مشکول ہیں انھیں سب جگہ مسکّن کرنا جائز نہیں کیونکہ تسکین سے ہر "فَعِلاتُ" اپنا روپ بدل کر "مفعولُ" ہو جائے گا اور اس طرح مفعولُ فاعِ لاتن مفعولُ فاعِ لاتن بحر مضارع اخرب ہو جائے گی کہیں سخت ضرورت ہو تو مصرع میں ایک "فَعِلاتُ" کو تسکین کے ذریعہ "مفعولُ" سے بدل سکتے ہیں۔ جیسے فراق صاحب کے چھٹے شعر میں رکن مفعولُ (بے ضرورت) وارد ہوا ہے۔ لیکن "نقوش" کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

پروانہ چھیڑنے ہی دو افسانۂ محبت — وہ یہ تھلا کے بولے بدا ہوش سے خدارا
مفعولُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن — فَعِلاتُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن

پروانہ (اس بحر یعنی بحر رمل مشکول میں) بغیر شکست ناروا کے ممکن نہ تھا اس لیے فَعِلاتُ (رکن مشکول) کو مسکّن کرنا پڑا۔

زحاف تسکین سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔ سخت ضرورت کے تحت اگر استعمال کرنا پڑے تو اس بات کا خیال رہے کہ بحر نہ بدل جائے جس سے شعر ترنم سے باہر ہو کر سماعت پہ گراں گزرے۔

اگر فراق صاحب مطلع بحر رمل مشکول (فَعِلاتُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن) میں کہتے تو اعتراض کی نوعیت قدرے خفیف ہو جاتی لیکن اب تو انھوں نے مفعولُ سے فَعِلاتُ تراش لیا ہے جو کسی مروجہ زحاف سے بن ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے

"جوئے شیر اٹھی بہا کر غزل کہنا"

(رمز آفاقی گنوری)

میسور کی بازاری اردو

"ہماری زبان" کے پندرہ اپریل ۱۹۷۷ء والے شمارے میں جناب نجم الحسن انجم ادیب کا مضمون بعنوان "میسور کی بازاری اردو" نظر سے گزرا۔ مولانا شاہ ابوالحسن ادیب مرحوم کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے جناب انجم ادیب نے لکھا ہے "افسوس کہ آپ (مولانا شاہ ابوالحسن ادیب) کی بہت سی کتابیں دوسروں کے نام سے شایع ہو چکی ہیں نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا"

یہ حقیقت ہے کہ شاہ ابوالحسن ادیب مرحوم جنوبی ہندوستان میں اردو ادب کے لیے بہت سا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ولی اللہ نے اپنی کتاب "میسور میں اردو کی نشوونما" میں لکھا ہے کہ ان کی چھوٹی چھوٹی تصانیف دو سو سے زیادہ ہیں لیکن انجم ادیب صاحب کا دعویٰ کہ ان کے والد بزرگوار مرحوم کی بہت سی کتابیں دوسروں کے نام سے شایع ہو چکی ہیں کہاں تک حق بجانب ہے خود ہی بہتر جانتے ہیں۔ جہاں تک میسور میں اردو کا سوال ہے اور جہاں تک میری واقفیت ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ادیب مرحوم کی کوئی بھی تصنیف کسی دوسرے کے نام سے شایع نہیں ہوئی ہے۔

میں جناب انجم ادیب سے درخواست کرتا ہوں کہ "ہماری زبان" کے ذریعہ وہ ان سارے میسوری ادیبوں کو صلیب پر کھینچ لائیں جنھوں نے ادیب صاحب مرحوم کی تصانیف کو اپنے نام سے شایع کرنے اور سستی شہرت حاصل کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ مجھے امید ہے انجم ادیب صاحب ان تمام ادیبوں کو صفائی پیش کرنے کا موقع بہم پہنچائیں گے جن کے متعلق انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

(عظیم الدین عظیم)

ابوعلی اعظمی صاحب رفیق دار المصنفین نہیں ہیں

میں نے اپنے مضمون "قول فیصل" مطبوعہ فروری میں ابوعلی اعظمی صاحب کو رفیق دار المصنفین لکھا تھا اور اس سے قبل ایک مراسلے کے بعض الفاظ سے یہ تاثر لیا گیا ہے کہ گویا ان کی رائے دار المصنفین کی رائے ہے۔ میری معلومات یہی تھیں لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ دار المصنفین سے ان کا یہ تعلق نہیں ہے۔ موصوف اس کے دفتری کارکنوں میں سے ہیں۔ اب میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان کی رائے سے دار المصنفین کی پالیسی کا کوئی تعلق نہیں۔ بلاشبہ ان کی کسی رائے یا تحریر کا ذمہ دار ادارہ نہیں ہو سکتا۔

(ابو سلمان شاہجہاں پوری)

انجمن ترقی اردو رانچی کا آئندہ لائحہ عمل

رانچی میں انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ عرصے سے قائم ہے لیکن بدقسمتی سے اب تک انجمن نے اپنی جدوجہد کا کوئی خاکہ مرتب نہیں کیا تھا۔ ۱۸ اپریل کو جب انجمن کا ایک عام جلسہ غلام سرور صاحب صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی صدارت میں منعقد ہوا تو اس موقع پر راقم الحروف نے سرور صاحب کی توجہ انجمن کے چند خاص مسائل کی طرف مبذول کرائی تھی۔ اس سلسلے میں حسب ذیل تجاویز اور مشورے بھی پیش کئے۔ میری گزارش ہے کہ ریاستی انجمن کے ذمہ داران تجاویز پر خاص توجہ دیں اور ان کی روشنی میں مقامی انجمن کا آئندہ لائحہ عمل مرتب کرنے میں ارکان انجمن کی رہنمائی اور مدد فرمائیں۔

(۱) صوبہ بہار میں اردو کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک مدلل اسکیم مرتب کی جائے اور اس پر عملدرآمد کے لیے رانچی میں ریاستی انجمن کا ایک مستقل نمائندہ مقرر کیا جائے جو مقامی انجمن کے اراکین اور دوسرے سربرآوردہ اشخاص کی مدد سے اس کام کو آگے بڑھا سکے۔

(۲) رانچی کے مشن اسکولوں میں ہندی اور بنگالی وغیرہ زبانوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام ہے لیکن اردو کی تعلیم کا سوائے سینٹ پال اسکول کے اور کسی مشن اسکول میں کوئی انتظام نہیں ہے۔ نام نوم (رانچی) کے مشن اسکول میں جہاں اب تک اردو کی تعلیم کا انتظام تھا وہاں اس سال سے اردو کی کلاسیں بند کردی گئی ہیں۔ یہ امر اس لحاظ سے کہ رانچی میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد پائی جاتی ہے تشویشناک ہے۔ انجمن کو جس کا بنیادی مقصد ہی اردو کی تعلیم و فروغ ہے اس پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ معلوم نہیں اب تک اس سلسلے میں انجمن کی طرف سے کوئی کوشش کیوں نہیں کی گئی نہ ہی اس ضرورت کو محسوس کیا جاسکا بہرحال اس سلسلے میں ریاستی انجمن کی سرپرستی میں ایک باضابطہ مہم جلد سے جلد شروع کردینی چاہیے۔ مشن اسکولوں کے انتظامیہ کو خطوط اور عرضداشتوں سے متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان اسکولوں کے سربراہوں کی خدمت میں ایک نمائندہ وفد بھی بھیجا جانا چاہیے جو ریاستی اور مقامی شاخ کے اراکین اور دوسرے سربرآوردہ اشخاص پر مشتمل ہو۔ دوسرے اسکولوں اور کالجوں میں بھی جہاں اردو کا معقول انتظام نہیں ہے اسی طریقۂ کار کو اپنانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے باقاعدہ جدوجہد ابھی سے شروع کردینی چاہیے۔

(۳) بڑے پیمانے پر اردو اسکول، مکتب اور شبینہ مدارس کے قیام کے لیے جدوجہد ضروری ہے جس سے اردو کی تعلیم اور فروغ و اشاعت کا مقصد خاطر خواہ طور پر حاصل ہوسکے۔

(۴) رانچی یونیورسٹی میں ایم۔ اے (اردو) کی تعلیم کے انتظام کی طرف بھی یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ریاستی انجمن کا ایک وفد جلد سے جلد یونیورسٹی کے وائس چانسلر، رجسٹرار اور خازن سے ملے اور ان پر اس ضرورت کو واضح کرے نیز وزارت تعلیمات حکومت بہار کو بھی اس طرف متوجہ کیا جائے اور اس سلسلے میں باقاعدہ جدوجہد کا خاکہ مرتب کرلیا جائے۔

(۵) رانچی کو صوبے میں پٹنہ کے بعد دوسرے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہے رانچی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر ضرورت ہے کہ یہاں کی شاخ کو بہار میں دوسرے مرکز کی حیثیت دی جائے اور اس کا حلقۂ کار پورے چھوٹا ناگپور کمشنری پر محیط ہو بلاشبہ یہ ریاستی انجمن کا ایک ذیلی ادارہ رہے گی لیکن اپنے حلقۂ عمل کی وسعت اور اپنے مخصوص مسائل کے اعتبار سے اسے ایک حد تک مستقل اور جداگانہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

(۶) انجمن کے سامنے ایک اہم مسئلہ اردو کتب خانے کے قیام کا بھی ہے۔ اگرچہ ایک اردو لائبریری یہاں عرصے سے قائم ہے لیکن اردو پڑھنے والوں کی ضرورت اس سے کماحقہ پوری نہیں ہوتی۔ لائبریری میں کتابوں کا جو سرمایہ ہے وہ قطعاً اطمینان بخش نہیں رسائل و اخبارات بھی واجبی آتے ہیں اگر علیحدہ سے اردو کتب خانے کا قیام فی الحال ممکن نہ ہو تو موجودہ اردو لائبریری ہی کو زیادہ موثر اور کارآمد اور اس کے انتظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تاہم یہ کام بھی تشنۂ تکمیل ہی رہے گا جب تک لائبریری کی عمارت میں توسیع نہیں کی جاتی بہرحال رانچی جیسی بڑی اور مرکزی جگہ میں ایک عظیم لائبریری کی ضرورت مسلم ہے اس سلسلے میں جس قدر جلد اقدام کرنے کی کوشش کی جائے بہتر ہے ریاستی انجمن کی رہنمائی اور تعاون اس سلسلے میں خصوصاً ضروری ہے۔

(۷) انجمن کو موثر بنانے کے لیے انجمن کی ازسرنو تنظیم (ممبر سازی و عہدیداران کا انتخاب) بھی ضروری ہے۔ یہ کام صوبائی انجمن کے ایک نمائندے کی نگرانی میں ہو تو بہتر ہے۔

(۸) مقامی انجمن کا ریاستی انجمن سے باقاعدہ اور مستحکم رابطہ قائم کیا جائے مقامی انجمن کو سرگرم اور متحرک بنانے اور اس کے نظم کو درست رکھنے کے لیے یہ رابطہ ضروری ہے

(۹) مقامی انجمن اپنا ایک اشاعتی منصوبہ بھی بنائے جس کا خاکہ

اگر ممکن ہو سکے تو ریاستی انجمن کی ہدایت اور مشورے سے تیار کیا جائے۔

ریاستی انجمن کا یہ فرض ہے کہ وہ مقامی انجمن کی سرگرمیوں اور منصوبوں میں خاطر خواہ ہاتھ بٹائے اور اس کی مخلصانہ رہبری کرتی رہے۔ (ابوذر عثمانی لکچرر شعبۂ اردو و فارسی رانچی کالج)

صرف ہندی میں درخواستیں قبول کرنے کی پالیسی اردو بولنے والی اقلیت اظہار تشویش

لکھنؤ۔ ریاستی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹریٹ اور ممبران مجلس قانون ساز کے ایک مشترکہ جلسہ میں مخلوط حکومت کے بعض وزراء کی اس ذہنیت پر اظہار تشویش کیا گیا کہ وہ صرف ہندی ہی میں درخواستیں وغیرہ قبول کریں گے اور کہا کہ یہ حکومت اور متحدہ قانون ساز پارٹی کی طے شدہ پالیسی کے منافی ہے اور اردو بولنے والی اقلیت کے خلاف جانے گا قرارداد میں حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ پر بالکل صاف طور سے فیصلہ کرے۔

(سیاست جدید کانپور)

ریسرچ ایسوسی ایشن شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا جلسہ

ریسرچ ایسوسی ایشن کا پانچواں جلسہ گذشتہ ۱۰ میں سمینار شعبۂ اردو میں ہوا۔ سید محمد علی کاظمی ریسرچ اسکالر نے اپنے تحقیقی مقالے کا ایک حصہ قاضی عبدالغفار کی ایک تصنیف "حیات اجمل" پڑھا۔ مقالہ میں کاظمی صاحب نے ان تمام محرکات کا جائزہ تفصیل سے پیش کیا جس کے زیر اثر قاضی عبدالغفار نے "حیات اجمل" لکھی۔ کاظمی صاحب نے ان حالات سے بھی بحث کی جو "حیات اجمل" کی تاخیر اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ فن سوانح نگاری کے اہم اصولوں سے بحث کرتے ہوئے کاظمی صاحب نے "حیات اجمل" کی فنی اور ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا۔ مقالہ پر ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب، انجم آرا انجم، مسعود علی ذوقی، ناصر علی خاں، محمد عتیق صدیقی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خورشید الاسلام صاحب نے خاصی تفصیل سے فن سوانح نگاری کے اہم اصولوں پر روشنی ڈالی اور ان اصولوں کی روشنی میں "حیات اجمل" کے مرتبے و مقام کو واضح کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے مقالہ نگار کے غیر جانبدارانہ انداز کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تحقیق اور تنقید میں یہ بڑا عیب پیدا ہو گیا ہے کہ ہر محقق اور نقاد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ مصنف کسی نہ کسی طرح سب سے بڑا ثابت ہو جائے جس پر اس نے کام کیا ہے۔ تحقیق اور تنقید میں جس غیر جانبداری اور معروضیت کی ضرورت ہے وہ نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ کاظمی صاحب نے بڑی حد تک غیر جانبداری اور معروضیت سے کام کیا ہے۔ اس کے بعد موصوف نے قاضی عبدالغفار صاحب کی ادبی حیثیت پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (نامہ نگار)

اردو کے سلسلے میں وزیر اعلا کو مراسلہ

لکھنؤ۔ ادارہ فروغ اردو ہند نے یو۔پی کے نائب وزیر اعلا جناب رام پرکاش کو ایک احتجاجی مراسلہ میں ان کے اس حکم کو جس کے تحت یکم مئی سے تمام سرکاری کاموں میں صرف ہندی قابل قبول ہوگی، دستور ہند میں دی گئی ضمانتوں کے خلاف قرار دیتے ہوئے ان سے وضاحت چاہی ہے کہ وہ اردو کے سلسلہ میں متحدہ غیر کانگریسی سرکار کی منظور شدہ پالیسی کی تحریری اطلاع دیں۔

یو۔پی کے وزیر اعلا جناب چرن سنگھ کو بھی ادارہ فروغ اردو نے ایک مراسلہ بھیجا ہے۔ ۲۳ مارچ کو ادارہ فروغ اردو کی مجلس انتظامیہ اتر پردیش کی غیر کانگریسی سرکار کے اردو موقف پر حکومت کے تحریری جوابات آجانے پر غور کرے گی۔ (قومی آواز)

اردو کو جائز مقام دیجیے یو۔پی کے طلبا کا نئی حکومت سے مطالبہ

لکھنؤ۔ یو۔پی۔ اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کا ایک وفد جناب امیر حیدر کی رہنمائی میں صوبہ کے وزیر تعلیم سے ملا۔ وفد نے وزیر تعلیم و نائب وزیر اعلیٰ سے ملاقات کر کے ان کے سامنے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے سے متعلق میمورنڈم پیش کیا۔ میمورنڈم میں کہا گیا تھا کہ اردو نہ صرف بھارت کی ایک زبان ہے، بلکہ صوبہ یوپی میں اس کا خاص مقام ہے جس کو پچھلی کانگریسی حکومت برابر نظر انداز کرتی رہی ہے۔ موجودہ حکومت سے ہم پر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس جائز و مناسب مطالبہ کو جلد از جلد تسلیم کر لے۔

وزیر موصوف نے وفد سے تقریباً پون گھنٹہ تک نہایت ہی خلوص سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ

۱۔ ہم اردو کو ایک بھاشا کی حیثیت سے ہر طرح آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔

۲۔ اسکولوں اور کالجوں میں ضروری تعلیمی سہولت دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔

۳۔ وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں دیگر مناسب کارروائی کرنے کو بھی تیار ہیں۔

لیکن موصوف نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسری سرکاری زبان سے آپ لوگوں کا کیا مقصد ہے یعنی جو اس زبان کو نہ پڑھنا چاہے اس پر بھی یہ زبان لاد دی جائے۔ موصوف نے یہ بھی کہا ہماری کابینہ کے [illegible] بھی اس سلسلہ میں ہمیں تسلی بخش جواب نہیں دے پا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسری زبان کے نام سے ہی صرف دلچسپی ہے۔ موصوف نے آخر میں کہا کہ جلد ہی اس سلسلہ میں آپ لوگوں سے پھر بات کروں گا اور اس مسئلہ کے حل کے لیے میں بھی کوشاں ہوں۔

(قومی آواز)

تبصرہ

مختار الدین احمد

مثنوی حیات و کائنات

پروفیسر عبد المجید شمس عظیم آبادی

صفحات ۱۰۴

کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت ۵ روپے

ناشر: سائنٹفک پبلشرز، مجید ولا پٹنہ ۔ ۶

پروفیسر سید عبد المجید شمس علی گڑھ یونیورسٹی کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں ہیں۔ انھوں نے یہاں فن جغرافیہ کی تحصیل کی اور لندن جا کر تحقیقی مقالہ لکھا اور انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ وہ عرصہ تک شعبۂ جغرافیہ کے صدر رہے اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ سائنسی علوم کے مطالعہ اور درس و تدریس میں گذرا۔ اردو ادب سے انھیں بچپن ہی سے والہانہ عشق رہا ہے اور انھوں نے کسی منزل میں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے شعر کہنے شروع کیے اتفاق سے انھیں ان کے وطن (پٹنہ ہو گیا) ہی میں علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی جیسا استاد مل گیا جن سے وہ مشورہ سخن کرتے رہے اور جن کی صحبت میں انھیں فیض اٹھانے کے بہت مواقع ملے۔ ادارہ ادب پٹنہ کی ادبی نشستوں میں وہ برابر شریک ہوتے رہے اور اس زمانہ میں انھوں نے بعض کہانیاں بھی لکھیں اور شائع بھی ہوئیں۔

ان کی رباعیوں کا مجموعہ رباعیات مجید اور نظموں اور غزلوں کا مجموعہ پیام حیات زیر طبع ہے۔ مثنوی حیات و کائنات پیش نظر ہے یہ تقریباً سات سو شعروں کی مثنوی ہے جو گلزار نسیم کی بحر میں جناب جمیل مظہری کی فلسفیانہ مثنوی آب و سراب سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے

مثنوی کا مرکزی خیال کیا ہے اس کے متعلق خود شاعر کی زبان قلم سے سنیے۔

جدید سائنس کے اصول ارتقا پر اس مثنوی کا مرکزی خیال قائم کیا گیا ہے۔ یہ عالم آب و گل، موجودات و نباتات و حیوانات پر مشتمل ہے قدرت کے عمل ارتقا سے وجود میں آیا ہے اور اسی عمل کے ذریعے مدارج ہستی طے کرتا جا رہا ہے۔ انسان جو اس کائنات کا اہم عنصر ہے اپنے قدرتی اور تہذیبی ماحول کے زیر اثر ارتقائے خرد کے مختلف منازل کو طے کرتا ہوا موجودہ منزل تک پہنچا ہے اور عارضی تمدنی پسپائیوں کے باوجود آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس مثنوی میں موجودہ انسانی تمدن کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور انفرادی و اجتماعی مفاد کی خاطر لائحہ عمل متعین کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے آخر میں انسانی جد و جہد کی عظمت اور اس کی ترقی کے لامحدود امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے

سائنسی موضوعات پر کچھ لکھا جائے تو نظم چھوڑ نثر کی زبان کچھ بوجھل سی ہو جاتی ہے پروفیسر عبد المجید کا اعجاز یہ ہے کہ سائنس کے دقیق مسائل بھی جب انھوں نے پیش کیے ہیں تو زبان کی لطافت، حسن اور تازگی برقرار رہی ہے۔ انسان کی خلقت سے پہلے زمین کی تپش کم ہو گئی ہے۔ بحر و بر اور کوہ و وادی بننے لگے ہیں زندگی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں اور زمین پر ٹھنڈک آ گئی ہے اس وقت کی تصویر دیکھیے۔

کم ہونے لگی تپش زمیں کی ۔ بننے لگے بحر و کوہ و وادی

ٹھنڈک جو زمیں پہ آ گئی اور ۔ بھر بھرے فلک نے بھیجے بادل

جھیلیں تھیں کہیں کہیں تھیں نہریں ۔ اٹھتی تھیں ہوا سے ان میں لہریں

جھرنوں کے وہ دلنواز نغمے ۔ دریا کے وہ دلربا ترانے

پانی جو برس کے کھل گیا تھا ۔ گردوں پہ دھنک کا تھا تماشا

سورج کی کرن کے ساتھ جلوے ۔ تھے رنگ برنگ کے اکٹھے

ہر شام شفق کی رنگ سازی ۔ نارنجی، سرخ اور پیازی

تاروں کی بوقت شب وہ محفل ۔ وہ نرم خرام ماہ کامل

تھا سب کا گماں یہ کہکشاں پر ۔ ہے نور کی نہر آسماں پر

گردوں سے شہاب کا اترنا ۔ تاریک فضا میں نور بھرنا

مریخ، عطارد اور زہرہ ۔ روشن ان سے تھی بزم دنیا

اک سمت تھا مشتری منور ۔ ضوبار، جمیل، نور پیکر

سیاروں میں اس طرف زحل بھی ۔ کرتا تھا فلک سے جلوہ ریزی

سیاروں کے ساتھ تھے ستارے ۔ جو چرخ کو جگمگا رہے تھے

تھی مثل فلک زمیں بھی شاداں ۔ اور حسن و ادا پہ اپنے نازاں

گو بزم جماد سج گئی تھی ۔ حیوان و نبات کی کمی تھی

آخر ہونے لگا ہویدا ۔ پانی میں وجود زندگی کا

یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد کا نقشہ ملاحظہ کیجیے۔

تہذیب کی ناؤ چل چکی تھی ۔ منجدھار سے اب نکل چکی تھی

رفتار میں آ رہی تھی تیزی ۔ جویا تھی نئی نئی زمیں کی

اب اس کے بڑے بڑے تھے ماجھی ۔ ہر بحر کو جانتے تھے ماجھی

طوفان کے حال سے تھے واقف ۔ گرداب کی چال سے تھے واقف

طاقت سے جو چل رہی تھی کشتی ۔ اب حاجت بادباں نہیں تھی

کشتی سے جہاز بن چکے تھے ۔ ہر بحر میں بن گئے تھے رستے

ہر سمت تھا شور انجنوں کا ۔ طوفاں پہ تھا زور انجنوں کا

راہیں تھیں نئی نئے تھے ماجھی ۔ طاقت تھی نئی، نئی تھی کشتی

تاریکی جہل سے نکل چکی تھی ۔ دنیا کروٹ بدل چکی تھی

علمی تمدن اور سائنس کے سنجیدہ مسائل کو شعری حسن برقرار رکھتے ہوئے رواں اور کامیاب نظم میں پیش کرنا آسان نہیں لیکن اس مقام سے سرخرو ہو کر پروفیسر عبد المجید شمس نے فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے اور وہ اس ذمہ داری سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا